سردار محمد چودھری کی آپ بیتی ''متاعِ فقیر'': ایک تاریخی دستاویز

Sardar Muhammad Chaudhry's Autobiography "Mata-e-Faqeer": An Historical Document

[i] عمران خالق [ii] ڈاکٹر رافعہ ملک

Abstract:

"Mata-e-Faqeer" is the autobiography of Sardar Muhammad Chaudhry, former Inspector General of Police, Punjab. He has written it with great honesty and sincerity. Despite having served on some of the highest posts in the bureaucracy, he never forgot his past. In this autobiography, the author has narrated the story of his life in simple yet beautiful language, which clearly shows his mastery over the art of writing. His style reflects that he is a truthful and straightforward person. Then he explains how they reached Lahore and later migrated to Toba Tek Singh. Due to the lack of employment opportunities there, his father began a modest job. The author details how his education continued — how he stood first in the matriculation examination in the district of Lyallpur (now Faisalabad), then moved to Lahore for higher studies, and how he gained admission to Government College Lahore. He also mentions his companions and peers in Lahore, his preparation for the competitive examination, and how he did not lose courage after his initial failure. Eventually, he passed the CSS exam and joined the Police Service. After completing his training in East Pakistan, he began his professional career in Abbottabad. During this time, he mentions that his marriage was arranged with Bilqis, and he describes how their married life went on. The death of Bilqis had a deep impact on him, and the later events of his life are also included in this autobiography.

Keywords: *Mata-e-Faqeer, Autobiography, Sardar Muhammad Chudhary, Partition, India, Pakistan.*

''متاعِ فقیر'' سردار محمد چودھری، سابق انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب، کی خودنوشت ہے۔ انھوں نے یہ کتاب نہایت دیانت داری اور خلوص کے ساتھ لکھی ہے۔ وہ اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ اس خودنوشت میں مصنف نے اپنی زندگی کی داستان سادہ مگر دلکش زبان میں بیان کی ہے، جو فنِ تحریر پر ان کی گرفت کو واضح کرتی ہے۔ ان کا اسلوب اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ ایک سچے اور صاف گو انسان ہیں۔ وہ ہجرت کر کے لاہور پہنچے اور بعد ازاں ٹوبہ ٹیک سنگھ چلے گئے۔ وہاں ان کے والد نے ایک معمولی ملازمت اختیار کی۔ مصنف اپنی تعلیمی زندگی کی تفصیل بھی پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں میٹرک کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ حاصل کیا۔ وہ لاہور میں اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں، مقابلے کے امتحان (سی ایس ایس) کی تیاری، اور ابتدائی ناکامی کے باوجود حوصلہ نہ ہارنے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ بالآخر انھوں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور پولیس سروس میں شامل ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں تربیت مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایبٹ آباد میں اپنے عملی کیریئر کا آغاز کیا۔ اسی دوران وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی شادی بلقیس سے طے پائی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی کے احوال بیان کرتے ہیں۔ بلقیس کی وفات نے انھیں گہرے طور پر متاثر کیا، اور ان کی زندگی کے بعد کے واقعات بھی اس خودنوشت میں شامل ہیں۔ یہ مقالہ اس آپ بیتی کو بہ طور ایک دستاویز کے پیش کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: متاعِ فقیر، آپ بیتی، سردار محمد چودھری، تقسیمِ ہند، پاکستان، بھارت۔

متاعِ فقیر سردار محمد چودھری سابق انسپکٹر جنرل آف پولیس پنجاب کی آپ بیتی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنا ماضی و حال ایمانداری و خلوص سے بیان کیا۔ انھوں نے یہ آپ بیتی اپنے کزن ڈاکٹر پیر محمد طور

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان کیمپس (Corresponding Author)
[ii] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان کیمپس۔

اور ناصر شمسی کی تحریک پر لکھی۔ جس کی زبان سادہ اور الفاظ نہایت خوب صورت ہیں۔ آپ بیتی لکھتے وقت ان کی عمر باسٹھ سال تھی۔ وہ اپنے دل اور گردوں کے علاج کے لیے امریکا گئے ہوئے تھے، وہاں انھوں نے اپنی نجی زندگی کے گزرے ایام کو قلم بند کیا۔ اور یہ کام انھوں نے پندرہ دنوں میں مکمل کر لیا۔

مصنف کو پاکستان سے جذباتی لگاؤ تھا اپنے آباء و اجداد کے ساتھ تقسیم کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ جب ان کی عمر صرف دس سال تھی۔ ہندوستان میں اپنے علاقے کے متعلق بیان کرتے ہیں:

> ہمارا گاؤں کوٹھیرہ جسوالان مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کی تحصیل اونہ میں کوہ شوالک کے دامن میں واقع تھا۔ (تحصیل اونہ کو بعد ازاں نے تشکیل پانے والے صوبہ ہماچل پردیش میں شامل کر دیا گیا اور آج کل اسے ضلع کی حیثیت حاصل ہے) گاؤں کی آبادی ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب تقریباً برابر تھا۔ مسلمان تمام تر گوجر تھے ماسوائے سیدوں کے چند گھروں کے۔ اہلِ حرفت میں کریمونائی اور فقط ایک ترکھان مسلمان تھا۔ باقی لوہار چمار اور جولاہے سب کے سب غیر مسلم تھے۔ ہندو آبادی زیادہ تر جسوال راجپوتوں اور چند برہمن خاندانوں پر مشتمل تھی۔ سکھوں کا صرف ایک گھر تھا۔ گاؤں میں ایک مسجد اور دو مندر تھے۔ گاؤں کے لوگ امن و آشتی سے رہتے اور ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتے تھے۔ سکھ خاندان کا ایک لڑکا جگندر سنگھ میرا کلاس فیلو اور دوست تھا۔[1]

اور اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ہم بھارت کے ضلع ہوشیار پور موضع کوٹھیرہ جسوالاں میں پیدا ہوئے۔ پیر محمد کا گاؤں ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی دلماں تھا مگر ان کے والد چوہدری ابراہیم صاحب ہمارے گاؤں کو کوٹھیرہ جسوالاں میں پٹواری تعینات تھے۔ یوں ہم ساتھ ساتھ پیدا ہوئے اور مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے ساتھ ساتھ ہی پلے پوسے ہیں۔ طور ان کا گوت ہے اور میرا گوت دیدڑ ہے۔ ہم دونوں گوجر قبیلہ سے تعلق رکھتے

ہیں ہمارے آپس میں ایک سے زیادہ رشتے ہیں۔ آسانی کے لیے آپ انھیں میرا کزن یا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ میرا سگا بھائی کوئی نہیں ہے۔[۲]

اپنے خاندان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ''میرے طویل القامت اور بھاری ڈیل ڈول کے مالک نانا ہیرا بتایا کرتے تھے کہ ہمارا خاندان بلخ اور بخارا سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارے اجداد وہاں سے نقل مکانی کر کے سوات کاغان اور کشمیر کے راستے پنجاب میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دریائے کنہار اور آس پاس کے علاقہ کی حسن و خوب صورتی کے متعلق پرانے گیت بھی سنایا کرتے تھے''۔[۳]

ہندوستان میں اپنے گاؤں اور وہاں کے باسیوں کے بارے میں مصنف نے تحریر کیا ہے کہ وہاں لوگ کس طرح رہتے تھے۔ ان کے والدین وہاں کھیتی باڑی کرتے وہ پہاڑی علاقہ تھا زیادہ تر لوگ جانور پالتے۔ جب برصغیر کی تقسیم کے اعلان ہوا تو ہر طرف خوف پھیل گیا کہ فسادات شروع ہو گئے، مصنف لکھتے ہیں:

> ۱۹۴۷ کا سن ہے۔ سکول میں گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ عید کی آمد آمد ہے مگر کچھ عجیب سی اداسی ہے۔ ہر آدمی ہراساں ہراساں سا نظر آرہا ہے۔ روزے رکھ رہا ہے اور ہڑبڑا بھی رہا ہے۔ فضا میں کچھ خوف خوف سا ہے ایک ان دیکھا سا خوف۔ تین جون کے کیبنٹ مشن پلان کا اعلان ہو چکا ہے، ہندوستان تقسیم ہو گا۔ ایک حصہ بھارت کہلائے گا اور دوسرا پاکستان۔[۴]

قدرت اللہ شہاب اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

> اس پس منظر میں برطانوی کیبنٹ مشن آزادیٔ ہند کی گتھی سلجھانے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان وارد ہوا۔ مشن میں لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے۔ وی۔ الیگزینڈر شامل تھے۔[۵]

تقسیم کے اعلان کے بعد عوام میں غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ملک کو تقسیم کس طرح کیا جائے گا۔ ان کا صوبہ کس طرح تقسیم ہوگا، دریا کس طرح تقسیم ہوں گے، وہ لکھتے ہیں کہ ''اس کا پتہ نہیں پنجاب تقسیم ہو گا۔ کوئی کہتا ہے کہ ستلج سرحد ہو گی اور کوئی کہتا تھا کہ بیاس مگر ہر

طرف ایک عجیب و غریب بے یقینی سی ہے۔"[۶]

ہر طرف خوف کے سائے تھے۔ روزمرہ کی زندگی شدید متاثر ہوئی۔ لوگ اس حد تک مایوس ہو گئے کہ زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو گئی۔ لوگ خود کو مردوں کے قریب شمار کرنے لگے۔ گاؤں کی عورتوں زیادہ قبرستان جانے لگیں۔ مصنف گاؤں کا ماحول تفصیلی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں اور سلطان سکول کی طرف جاتے ڈرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ حتی کہ اس طرف مسلمان وزیرا تیلی کا کولہو ہے۔ ہم وہ جھوٹے نہیں جاتے۔ یہ کیا ہو گیا؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ہم نیچے پر گری جامنیں اٹھانے نہیں جاتے، حالانکہ ہم سب بچے کتنے شوق سے وہاں جاتے تھے۔"[۷]

عید کا دن آ گیا۔ سب حسب معمول عید کے اجتماع جو کہ مسجد میں تھا میں شرکت کے لیے گئے، مگر ماحول میں اداسی ہر طرف تھی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ بچہ ہونے کے سبب وہ حالات کو بھانپ نہیں پا رہے تھے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ لوگ پہلے کی عیدوں کی طرح خوش نہ تھے اور نہ ٹھیک سے میل جول کر رہے تھے۔ عید کے اجتماع میں بھی پاکستان کے نعرے لگ رہے تھے: "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ بن کر رہے گا پاکستان۔ ہم لے کر رہیں گے پاکستان۔ پاکستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد! ارد گرد کے کھڈوں اور پہاڑوں کی طرف سے وہی آوازیں بار بار لوٹ کر آتی ہیں۔ پاکستان زندہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔"[۸]

اصل معاملہ کیا ہے۔ لوگ پہلے کی عیدوں کی طرح خوش نہ تھے اور نہ ٹھیک سے میل جول کر رہے تھے۔ عید کے اجتماع کے بعد میاں محمد بخش سب سے کہہ رہے تھے کہ اب پاکستان چلو۔ جو مسلمان ہے، وہ پاکستان چلے۔ جو مومن صادق ہے، وہ پاکستان چل پڑے۔ اب یہ گاؤں ہمارا نہیں، اب یہ زمینیں ہماری نہیں۔ اب یہ گھر ہمارے نہیں۔ اب یہ دیس ہمارا نہیں۔ چل بھائی چل اپنے پیا کے دیس۔ اپنے پیا کے دیس۔ اب گاؤں کے تمام لوگ سمجھ چکے تھے کہ اب انھیں یہاں سے لازمی کوچ کرنا ہو گا ورنہ حالات ٹھیک نہ رہے تو وہ مارے جائیں گے۔ اب بر صغیر کی تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کا دیس پاکستان ہے۔ اب ہندو یہاں انھیں رہنے نہیں دیں گے۔ اس لیے عید کے اگلے دن ہی گاؤں کے لوگ درختوں کے نیچے اکٹھے ہو گئے۔ بقول مصنف کہ اس کا دادا چودھری عمر بخش کے پاس اس کے تمام رشتہ دار جمع تھے۔ مصنف نے ان الفاظ میں اس اجتماع کا نقشہ کھینچا ہے کہ:۔

اس روز بھی میں نے سمجھا کہ شاید کوئی ایسی ہی تقریب ہو گی اور میں خوش خوش

بھاگ کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ہمارے دادا چوہدری عمر بخش وہاں براجمان ہیں اور بہت سے ہمارے رشتہ دار مامے، نانکے اور چچا پھوپھا قسم کے لوگ ان کے ارد گرد جمع ہیں اور طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہماری اور دوسرے لوگوں کی گائیں، بھینسیں اور بیل بکریاں ہیں۔ کچھ عجیب سا سماں ہے۔ یہ صورت حال میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ماحول سنجیدہ بھی اور لاابالی بھی۔ ہر طرف لوگ وہاں آ رہے ہیں۔ سواں پاکا ایک خوش پوش سا نوجوان آیا۔ حسب دستور اسے لسی پانی دیا گیا۔ اور پھر وہ حقہ کے کش پر حال احوال دینے لگا اور معلوم ہوا کہ وہاں کے ہندو جو ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے بستے آئے تھے، اور مسلمانوں سے دبتے تھے، اب انھیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مال پسو پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر نوجوان نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''اب یہاں وسیبا (بسنا۔ رہنا) بہت مشکل ہے۔ اگر یہاں رہنا ہے تو پھر ہم سب کو ہندو بننا پڑے گا اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہم مر جائیں گے مگر اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔ اور ہم سب نے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟''، ''ہم سب نے بھی یہی فیصلہ کر رکھا ہے۔'' سب لوگوں نے ایک وقت میں ایک ہی بات کر دی۔[۹]

لوگوں نے فیصلہ کر لیا تھا مگر تذبذب کا شکار تھے، کہ ان کے آباء و اجداد صدیوں سے اس جگہ مقیم ہیں۔ ان کی قبریں یہاں ہیں۔ اگر کوچ کر گئے تو ان کی قبروں سے دوری ہو جائے گی مگر حالات ایسے ہو گئے کہ وہاں رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لمحے وہ سوچ رہے تھے کہ ''کچھ کھانے پینے کو ملے گا یا بھی نہیں۔ سنا ہے کہ سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ خالی ہاتھ کیا کر لیں گے۔''[۱۰]

گاؤں کو چاروں طرف سے خطرات تھے۔ پہرہ لگا رہتا تھا۔ مصنف کے والد اور چچا بھی پہرہ داروں میں شامل تھے۔ وہ یاد کو یوں قلم بند کرتے ہیں کہ ''گفتگو ہو رہی تھی کہ سکھ بہت ظالم لوگ ہیں۔ ذرا ترس نہیں کرتے۔ مردوں کو نیزوں اور بھالوں میں پرو لیتے ہیں۔ عورتوں کو اٹھا لیتے ہیں اور بچوں کو ذبح کر دیتے ہیں۔''[۱۱]

تمام مسلمانوں کو جان بچانے کی فکر تھی، جب کہ وہاں کے ہندو ان کے مال مویشی اور گھریلو سامان پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ اور اسی انتظار میں تھے کہ یہ یہاں سے چلے جائیں یا مارے جائیں تو ان کے مال پر قبضہ کیا جائے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ کس طرح ان کے دادا کی خوب صورت بھینس جس کی کبھی قیمت ۹۵ روپے لگی تھی "انھوں نے پانچ روپے ہمارے دادا کی ہتھیلی پر رکھے اور بھینس کھول لی۔ میرے دادا کی زبان گنگ ہو گئی اور ان کی سفید داڑھی آنسوں سے تر تھی۔ میں نے اپنے دادا کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ دیکھ کر میں بھی رونے لگا۔ باقی سب لوگ بھی رو رہے تھے۔"[۱۲]

اس سے اگلے دن جب صبح ہوئی تو نہایت اداس صبح تھی لوگ پریشان تھے۔ گھر والے بھی کوئی رات کو پہرہ دینے گیا نہیں آیا، دادا مسجد گئے واپس نہیں آئے۔ اتنے میں لوہارلی کی گھاٹی کی طرف سے بہت ہی زیادہ تیز بھاگتا ہوا آدمی نمودار ہوا اور شور مچاتا گیا کہ سکھ آ گئے۔ سکھ آ گئے۔ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ مصنف کی والدہ نے کس طرح اپنے بچوں کو اپنی آغوش میں لیا۔ کس طرح سامان اکٹھا کیا۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں کیسے باندھیں اور اپنے بچوں کو کس طرح لے کر گھر سے نکلیں:

> دل بڑا کر کے ہماری ماں نے ہمارا چارج سنبھال لیا تھا۔ مرغی کی طرح ہمیں اپنے پروں کے نیچے لیے ساتھ والے جنگل۔۔۔۔ نہایت ہی گھنے جنگل کی طرف چل پڑیں۔ یہ وہ جنگل تھا جس میں ہم باگھ، بگھیاڑ، بندر اور دوسرے جنگلی درندوں سے ڈرتے داخل نہیں ہوتے تھے مگر آج ہمیں ان درندوں سے ذرا بھی نہیں ڈر لگ رہا تھا۔ ہم تو ایک اور قسم کے درندے کے خوف میں مبتلا تھے۔ اور ہمیں ہر طرف جھاڑی اور درخت کے پیچھے بھالے اٹھائے سکھ ہی نظر آ رہے تھے۔ خوف نے ایک عجیب شکل اختیار کر لی تھی۔ اور ہمیں ہر پتے سے سکھ ہی نظر آ رہے تھے، حالانکہ وہاں کسی سکھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہماری ماں کلمہ پڑھتی جائے اور شیرنی کی طرح بڑھتی جائے اور ہمیں تسلی دیتی جائے کہ بچو بالکل نہیں ڈرنا۔[۱۳]

مصنف اپنی بہنوں اور مال کے ساتھ اپنے ننیہال پہنچ چکے تھے۔ وہاں پر پہنچ کر بیان کرتے ہیں کہ ہم بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے۔ میری ممانی نے کھانا دیا تو زیادہ بھوک کی وجہ سے فوری کھا گیا۔ جب کہ عام دنوں میں اس طرح کی بھوک نہ لگتی تھی۔ ساتھ خدشہ تھا کہ شاید اب سفر میں اس طرح کا کھانا میسر نہ

آئے، اور "ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ کوچ کا حکم ہو گیا۔ میرا ایک رشتہ کے نانا تھے۔ بڑے ہی دراز قد تھے۔ لمبا چوڑا چکلا ان کا جسم تھا اور باقی دودھ جیسی داڑھی رکھتے تھے۔ اپنے سے اونچی ڈانگ لیے ایک پیغمبرانہ شان سے چل پڑے اور ہم سب ان کے پیچھے چل دیے۔ سب لوگ کلمہ شریف اونچی اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے۔ سب کو ایک دوسرے کا حوصلہ تھا، اور ایک دوسرے کو ہلہ شیری (حوصلہ) دے رہے تھے۔ ہماری منزل ہمارے دادا چچا کا تھیہ پر ڈیرا تھا۔"[۱۴]

ہجرت کا سفر درپیش تھا۔ اداسی اپنی جگہ موجود تھی۔ کھیتوں اور کمیلوں سے لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے بناتے تھے۔ سب انھیں تنبو کہہ رہے تھے۔ اس طرح کے تنبو بیساکھی اور رام لیلا کے میلوں پر لگتے تھے۔ میں نے سمجھا آج یہاں پر ایک میلہ سج گیا ہے، مگر یہ میلہ کسی اور ہی رنگ ڈھنگ کا تھا۔ راستے کی تکالیف اپنی جگہ تھیں۔ کھانے کو چاول ہوتے تو ساتھ گھی نہ ہوتا۔ مصنف کو اس لیے معلوم ہوتا کہ ان کی ماں پناہ گیر کسے کہتی تھی۔

مصنف جب اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ تھیہاں مقیم تھے۔ وہیں پر ان کے والد، چچا اور دادا ان کے پاس پہنچ گئے، مگر اس بار وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھے۔ سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب ان کو پریشانی لاحق تھی کہ سفر میں کھانے پینے کا کیسے انتظام ہوگا۔ اس لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ مصنف کے والد ان کی والدہ سے مخاطب تھے کہ "تم عجیب عورت کہ گھر سے چلتے وقت تم نے اپنا زیور بھی نہ اٹھایا۔ وہ تو شکر ہے کہ مجھے نظر آ گیا۔ وگرنہ وہیں رہ جاتا۔ بھاگوانے راستے میں یہی زیور کام آئے گا۔ اب تو اسی طرح منگ تنگ کر گزارا ہوگا، پھر پاکستان پہنچ کر سب کچھ مل جائے گا۔ مجھے وہاں کی فکر نہیں ہے، وہاں بابا قائد اعظم پہلے ہی پہنچ چکے ہیں۔ وہ ہمارا سب بندوبست کر دیں گے۔ مگر یہ راستہ واستہ کیسے کٹے گا۔ ہر طرف بھوترے ہوئے سکھ ہیں۔ سنا ہے جو مسلمان ملتا ہے اسے مار دیتے ہیں۔ کنویں زہر سے بھر دیتے ہیں اور آٹے میں پارہ ملا دیتے ہیں۔ بس یہ راستے میں مصیبت ہے۔ روکھی سوکھی بھلئے لوکے کاٹ لو، پاکستان پہنچ کر سب کچھ مل جائے گا۔ یہ زیور سنبھالو، میں اٹھا لایا ہوں اور یہ چھے سو روپے بھی۔ یہ بھی تم وہیں بھول آئی تھی۔ اس پنڈوکلی میں تو پڑے تھے جن میں زیور تھے۔"[۱۵]

منیر احمد منیر کو حاجی حبیب الرحمٰن نے انٹرویو کے دوران اپنے خاندان کی ہجرت کے بارے میں بتایا کہ "دو تین ٹرکیں تھیں جن میں سے ایک میں ہمارا سامان تھا اور ایک میں ہماری فیملی تھی۔ راستے میں

ہم پردہ اٹھا کے دیکھ رہے تھے کوئی لاش ادھر پڑی ہوئی ہے، کوئی لاش اُدھر پڑی ہوئی ہے۔ بری حالت تھی۔"[۱۶] یوں مسلمان مہاجرین نے اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ دیا۔ جس میں ان کی املاک، مال مویشی اور کاروبار شامل تھے۔ جب حالات خراب ہوئے تو مہاجرین کی جان بچانے کی ترجیح تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے بچوں کو لیا اور پاکستان کی راہ لی۔ جن مہاجرین کیمپ میں پہنچے وہاں بھی سہولیات کا شدید فقدان تھا۔ خوراک کا بندوبست تھا، نہ ہی صفائی کے مناسب انتظامات تھے۔ گندگی کی وجہ سے وبائی امراض پھیل رہے تھے۔ بڑوں اور بچوں کی اموات روزانہ کی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ مصنف کے والد کیمپوں کے حالات اس کی والدہ سے یوں بیان کرتے ہیں:

> سواتے کہیہ بھلئے کچھ بھی ناں نئیں بچیا۔ مجھاں گیئاں۔ ڈگے بچھے گئے۔ کھیت کھلیان اپنے نہ رہے۔ باغ باغیچے کدھر گئے۔ گھر رہیا نہ جھگی۔ اہیہ بال بچے مر جان گے۔ تینوں پتہ کیمپاں وچ کیہہ ہو ریا اے۔ مینوں بگھوان سنگھ نے دسیا اے کہ لوگ خاص طور تے بچے دھڑا دھڑ مر رہے نیں۔ حالے وی ویلا اے چل مڑ چلیے۔ بھگوان سنگھ تے پرس رام دوناں نے گارنٹی دتی اے کہ اوساڈی راکھی کرن گے۔ یہ کہہ کر ہمارے والد صاحب بھی رونے لگے۔ یہ منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ میرے ماں باپ اتنے دلگیر ہوں گے۔[۱۷]

اس پر مصنف کی والدہ جواب دیتی ہے کہ "چوہدری اب ہم واپس نہیں جائیں گے۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔ اب ہماری منزل پاکستان ہے۔ اب ہم پاکستان ہی جائیں گے۔ آپ کو یاد نہیں میاں محمد بخش کیا کہہ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ جو مسلمان پکا مومن ہے، وہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ وہ اب پاکستان چلے گا۔ وہی ہمارا گھر ہے۔"[۱۸]

پھر مہاجرین کا قافلہ چل پڑا۔ یہ مہاجرین مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ہوشیار پور پہنچ گئے۔ کوئی بیلوں پر سوار تو کوئی پیدل۔ تاحد نظر انسان ہی انسان تھے۔ مگر ہر کسی کی پیٹھ پر اس کا سامان ضرور تھا۔ اب اس قافلے کی منزل ہوشیار پور کا اسلامیہ کالج تھا۔ اسلامیہ کالج پہنچ کر مصنف حال یوں بیان کرتے ہیں:

> تاحد نظر انسان تھے اور طرح طرح کے خیمے اور تنبو۔ میں نے اتنے انسان ایک جگہ اور ایک وقت میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے میلا ضرور دیکھے تھے مگر اتنا بڑا

میلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ مہاجرین کا میلہ ذرا اور ہی قسم کا ہوتا ہے وہاں جلیبیوں اور پکوڑوں سے زیادہ بھوک اور بیماریاں بکتی ہے۔ بولیوں اور بھنگڑوں کی بجائے وہاں موت رقصاں ہوتی ہے۔ پناہ گیروں کے لیے پانی سے زیادہ خاک و خون ارزاں ہوتا ہے۔ یہ میلہ و کھری قسم کا تھا۔[۱۹]

اس اسلامیہ کالج ہوشیار پور میں مصنف نے کبھی پڑھنے کے خواب دیکھے تھے۔ مگر آج یہاں خاندان اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پناہ گیر کے طور پر آیا تھا۔ یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی ہو گی کہ ایک دن اس کالج میں پناہ کے لیے آنا ہو گا۔ اب اس کیمپ میں بھی مسلمان محفوظ نہیں تھے۔ مصنف کے خاندان کے ساتھ دل خراش واقعہ یہ پیش آیا کہ اس کے چچا اور چچی رفع حاجت کے لیے کیمپ کے ساتھ والے کھیت میں گئے۔ اس کھیت پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے چچا چچی کو بھی نیزے لگے۔ انھوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس واقعے میں آٹھ مسلمان مارے گئے اور باقی بہت سے زخمی ہوئے۔ مصنف کہتے ہیں میرے چچا اور چچی کی موت کا ہمارے خاندان کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔

کیمپوں کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر طرف گند ہی گند تھا۔ مصنف بیان کرتے ہیں کہ "ایسا گند اور غلاظت کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ بدبودار اور غلیظ ترین چیز انسان کا اپنا ہی فضلہ ہے۔ سب بیمار تھے۔ سب جگہ بیماری تھی۔ کوئی اٹھ نہیں سکتا تھا اور کوئی چل نہیں سکتا تھا۔ سب کا کھانا پینا دوا دارو پانی وھانی۔ بولی پیشاب اور۔۔۔ سب کچھ وہیں تھا۔۔۔ باہر خوف کے پہرے لگے تھے۔ سکھوں کا خوف ایسا تھا کہ ہر ایک کی جان نکلتی جا رہی تھی۔"[۲۰]

باہر کے حالات بہت خراب تھے۔ بس مسلم لیگ کے رضاکار کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوتے۔ جب آتے تو کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ دوا دارو بھی لاتے۔ مگر باہر سکھوں اور ہندوؤں نے پانی والے کنوؤں میں زہر ڈال دیا۔ کئی ٹرینوں پر حملہ کر کے تمام مہاجرین کو مار دیا۔ جب بھی ایسی خبریں آتیں، ہم سب مزید ڈر جاتے۔ لوگ باہر کے حالات کے خوف سے مزید کیمپوں کا رخ کرنے لگے۔ کیمپوں کے اندر بھی حالات ٹھیک نہ تھے۔ اندر روز کئی لوگ موت کے مُنھ میں جا رہے تھے۔ ان کے دفن کرنے کے لیے قبریں نہیں تھیں۔ گڑھے کھود کھود کر ان میں ڈالا جا رہا تھا۔ مصنف بیان کرتے ہیں کہ :۔

کیمپ میں ہر روز اتنے لوگ مرتے تھے کہ سب کو اکٹھا کسی بڑے گڑے میں دفنانا

پڑتا تھا۔ اکثر اوقات کتے ان قبروں سے تازہ لاشیں نکال کر چیر پھاڑ کر کھا جاتے۔[۲۱]

انسان اختلافات کے درجے سے گر چکے تھے۔ اب قتل ڈاکہ سب جائز تھا۔ ہر انسان پناہ کی تلاش میں تھا۔ مسلم لیگ کے کچھ رضا کار آئے۔ انھوں نے پناہ گیروں کو نوید دی کہ کل تیار رہیں ایک ٹرین پاکستان جا رہی ہے، تیار ہو جائیں۔ کل آپ کو ٹرین پر سوار کروا دیں گے۔ ماں رضاکاروں کی تعریف کرنے لگی کہ کیسے فرشتہ صفت انسان ہیں۔ کہ کھانا کھانے کے لیے دیتے ہیں۔ مریضوں کے لیے دوا کا انتظام کرتے ہیں۔ ہمارے لیے بستروں کا انتظام کرتے ہیں۔ اب ٹرین کی خوش خبری سنا کر گئے ہیں، مگر مصنف کا خاندان اس ٹرین پر سوار نہ ہو سکا۔ پھر اس کے بعد کئی دنوں تک ہوشیار پور سے پاکستان ٹرین نہ جا سکی۔ پھر ایک دن خوش خبری ملی کہ کل صبح ٹرین پاکستان جائے گی۔ اس پر ہوشیار پور کیمپ سے مہاجرین سوار ہو کر پاکستان جا سکیں گے۔ مصنف اپنی ٹرین کے سفر کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:۔

> رات کے اندھیرے میں ہماری ہی طرح اور بہت سے مسلمان مہاجر گرتے پڑتے اس راہ امید پر چل رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی ریل گاڑی آ گئی اور ہم ان خوش قسمتوں میں سے تھے جنھیں ریل کے ڈبوں کے اندر جگہ مل گئی ورنہ اک جہان تھا جو ٹرین کی چھتوں پر اٹکا ہوا تھا۔ ریل کے اندر انسان اس طرح گھسے اور دھنسے ہوئے تھے جیسے ڈبوں کے اندر سارڈین مچھلیاں۔۔۔ انسان پر انسان چڑھا ہوا تھا اور حبس ایسا کہ سانس بند ہو جائے۔[۲۲]

مصنف کے مطابق ٹرین کا سفر بھی غم ناک تھا۔ لوگ راستے میں بہت زیادہ اللہ کو یاد کر رہے تھے۔ پریشان بھی بہت تھے۔ راستے کے حالات کے متعلق مصنف بیان کرتے ہیں کہ ''مختلف ریلوے اسٹیشنوں سے گزرتی ہوئی ٹرین جب امرتسر کے پاس دریائے بیاس سے گزر رہی تھی تو سب لوگ باہر دیکھ دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ میرے دادا بالکل بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ دیکھو لاشیں۔۔۔ لاشیں ہی لاشیں۔''[۲۳]

کتنا اذیت ناک منظر تھا کہ سب لاشوں کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہے تھے، دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پہچان کر کہتے کہ یہ فلاں کی ہے، یہ فلاں کی لاش ہے۔ ہمیں بھی ساتھ مر جانا چاہیے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہاجرین کتنی تکلیف سے گزرے، انھوں نے کیا کیا مصائب اٹھائے دریائے بیاس کے

کنارے جو کیمپ تھے۔ ان کے مہاجرین کو بارشیں بہا کر دریا میں لے گئیں، باقی سکھوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ انھوں نے انھیں کاٹ کاٹ کر دریا میں پھینک دیا۔

بقول مصنف کے امرتسر میں اس وقت بہت قتل عام ہو رہا تھا۔ جیسے ہی ٹرین ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو تمام مسافر گھبرا گئے۔ کیوں کہ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے سارے کلمہ پاک پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹرین چل پڑی اور اس میں سوار مہاجرین نے سکھ کی سانس لی۔ آگے جا کر بیابان جگہ پر ٹرین ٹھہر گئی تو مصنف نے وہ منظر اس طرح پیش کیا:

> ٹرین ایک سنسان جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ سب لوگ ڈر گئے اور سسکیاں بھرنے لگے کہ اب سکھ آئے کہ آئے۔ ساری گاڑی مقتل کے انتظار میں کھڑی تھی اور ہر ایک مرنے کے لیے تیار تھا۔۔۔ ہماری والدہ نے مجھے اور میری بہنوں کو سیٹوں کے نیچے چھپا دیا اور ایک چادر ہم پر ڈال دی، پھر کلمہ پڑھتی جائیں اور ساتھ کہتی جائیں۔۔۔ اللہ دے حوالے۔۔۔ ساتھ ساتھ روتی جائیں۔[۲۴]

مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس خوف کے عالم میں بلوچ رجمنٹ کے ایک سپاہی نے کہا جو ہمارا محافظ تھا کہ اب انجن لاہور سے آئے گا۔ آپ لوگ تسلی رکھیں۔ دوسرے ڈبوں میں بھی بلوچ رجمنٹ کے سپاہی آ گئے ہیں۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، سکھ ادھر نہیں آئیں گے۔ رات کے وقت وہ انجن پہنچ گیا اور ٹرین لاہور کی طرف رواں دواں ہو گئی اور سب کی جان میں جان آ گئی۔

مصنف نے تحریر کیا کہ جب یہ ٹرین ہندوستان کے آخری ریلوے اسٹیشن اٹاری پہنچی تو فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مہاجرین پاکستان میں داخل ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ سب ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو کتنا پیارا ہے پاکستان۔ یہاں تمام خواب پورے ہوں گے۔ سادہ لوح مہاجرین کہہ رہے تھے کہ یہاں گھی شکر کھانے کو ملے گا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ اب آزادی کے ساتھ مساجد میں جا کر نماز ادا کیا کریں گے۔ جب ٹرین لاہور پہنچی تو مصنف بیان کرتے ہیں کہ:۔

> میرے والد اور والدہ وہیں ریلوے اسٹیشن پر سجدے میں گر گئے۔ اور میرے دادا، چچا اور دیگر سب ہی لوگ سربسجود تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سب پاکستان کی سرزمین کو چوم رہے تھے۔۔۔ اور میں بھی اسی طرح اپنے بزرگوں کے

پیچھے پیچھے سجدہ ریز ہو گیا۔[۲۵]

سردار محمد چودھری نے برصغیر کی تقسیم کی پوری تاریخ اپنی آپ بیتی کی صورت میں تحریر کی ہے۔ ہندوستان میں مسلمان کس طرح رہتے تھے۔ ان کا ذریعے معاش اور ثقافت کیسی تھی۔ پھر جب تقسیم کا اعلان ہوا تو کس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ مہاجرین نے کس طرح اپنے گھر بار کو چھوڑا۔ راستے میں کن کن مصائب کا سامنا کیا، کیسے پاکستان پہنچے۔ سردار محمد چودھری نے تمام تر مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی آپ بیتی میں برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کو تاریخ کی صورت میں قلم بند کیا۔

حوالہ جات

۱۔ سردار محمد چودھری، جہانِ حیرت (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۲۲ء)، ۲۹۔
۲۔ سردار محمد چودھری، متاعِ فقیر (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۲۱ء)، ۱۹۔
۳۔ سردار محمد چودھری، جہانِ حیرت، ۲۹۔
۴۔ سردار محمد چودھری، متاعِ فقیر، ص ۲۴۔
۵۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۴ء)، ۱۷۷۔
۶۔ سردار محمد چودھری، متاعِ فقیر، ص ۲۴۔
۷۔ ایضاً، ص ۲۵۔ ۸۔ ایضاً، ص ۲۵۔
۹۔ ایضاً، ص ۲۷۔ ۱۰۔ ایضاً، ص ۲۸۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۹۔ ۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۵۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۶۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۹۔
۱۶۔ منیر احمد منیر، کیا کیا نہ دیکھا (لاہور: آتش فشاں، ۲۰۱۹ء)، ۴۸۔
۱۷۔ سردار محمد چودھری، متاعِ فقیر، ص ۳۹۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۳۹۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۶۔ ۲۱۔ ایضاً، ص ۴۶۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۵۰۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۵۰۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۵۱۔ ۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴۔